R. N. 2186/57. | Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No 29
Telegrams "ANJUMAN"

قیمت
ایک پرچہ
تاریخ اشاعت

جلد ۲۰ - شمارہ ۴۱ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۸ر نومبر ۱۹۶۱ء

قاضی معراج دھولپوری

دیوان جانی بہاری لال راقمؔ بھرتپوری

"دیوان جانی بہاری لال راقمؔ" کے زیرِ عنوان جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی کا مضمون اخبار ہماری زبان ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء میں نظر نواز ہوا۔ جانی جی کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہوتے، سکسینہ صاحب بخوش اسلوبی اس کمی کو پورا کر سکتے تھے کیونکہ موصوف کو مسٹر ایم جعفر کے مضمون مطبوعہ "زمانہ" ستمبر ۱۹۳۰ء کے علاوہ اس ضمن میں "حسبِ حال" نام راقمؔ کی کوئی نامعلوم تصنیف بھی دستیاب ہو گئی تھی جس میں مصنف نے بقول سکسینہ صاحب "اپنی سرگزشت بیان کی ہے" مگر باوجود اس کے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ صاحبِ مضمون نے حد درجہ اختصار سے کام لیا اور متعلقات حالاتِ راقمؔ تشنہ رہ گئے۔

مضمون نگار صاحب نے ایم۔ جعفر صاحب کا جو خلاصہ پیش کیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راقمؔ تیئس (۲۳) سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے رہے جب کہ خود مصنف کے بیان سے ان کا پندرہ سال کی عمر میں ملازم ہو جانا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح مندرجہ خلاصے سے ان کی ملازمت کے سلسلے میں بھی کوئی تاریخی نتیجہ مستنبط نہیں ہوتا اور پھر خدمات کے تقدم و تاخر میں بھی الٹ پھیر معلوم ہوتا ہے۔ تصانیف بھی مضمون میں تشنۂ تفصیل ہیں اور مندرجہ تاریخیں بھی صحیح نہیں۔

جانی جی کی متعدد اور فاضلانہ تصانیف کو دیکھ کر نیز تذکرہ جات میں "اردو" تالیف کے پیشِ نظر راقم سطور کو راقمؔ کے مفصل حالات معلوم کرنے کی جستجو ہوئی تھی۔ چنانچہ متعلقہ ادبی ریکارڈ کی ورق گردانی کی مگر مقصد پورا نہ ہو سکا۔ بالآخر گزیٹیر وغیرہ قسم کی کتابوں کی جانب رجوع ہوا۔ پس مذکرہ وسائل اور جانی جی کی تصانیف کے مطالعے سے جو واقفیت بہم پہنچی۔ اسی کو غنیمت جان کر محفوظ کر لیا جس کا خلاصہ سطورِ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے تاکہ وہ نامور استاد راقمؔ سے متعارف و قریب تر ہو سکیں۔

دورانِ جستجو کئی بار بھرت پور جانا بھی ہوا۔ معلومات فراہم کرنے کی وہاں بھی میں نے پوری پوری سعی کی لیکن حتمی طور پر کچھ نہ معلوم ہو سکا سوائے اس کے کہ جانی جی کی عالیشان حویلی جتی جی کے مندر کے قریب واقع ہے جو اس وقت ان کے کسی عزیز کے قبضہ و تصرف میں ہے مگر وہ بسلسلۂ روزگار بھرت پور سے باہر رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے میری ملاقات بھی باوجود اشتیاق کے ان سے نہ ہو سکی۔ مکان سے تھوڑے فاصلے پر دوسرے محلے میں ایک مختصر سی دھرم شالہ بھی نظر آئی جس پر "جانی بہاری لال" بخطِ اردو کندہ ہے۔ باشندگانِ قربِ جوار سے اس کے متعلق دریافت حال کیا مگر وہ مکمل واقفیت بہم پہنچانے سے قاصر رہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ دھرم شالہ بھی ہنوز جانی جی کی یادگار ہے۔

مئی ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ کو ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے موقع پر راجپوتانے کے ایجنٹ سکریٹری کے۔ ایم۔ والٹر صاحب کو جانی جی نے بزبانِ انگریزی ایک قصیدہ پیش کیا تھا جو راقم سطور کے کتب خانے میں مطبوعہ محفوظ ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ؎

"Now I am of Seventy Three"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ میں وہ تہتر سال کے تھے۔ اس حساب سے ان کا سالِ ولادت ۱۸۱۵ء متعین ہوتا ہے۔ نہ کہ ۱۸۲۷ء/۱۲۴۳ھ جو سکسینہ صاحب نے اپنے مضمون میں بتایا ہے۔

منقولہ بالا مصرعے سے اوپر والے بند میں وہ اپنی ملازمت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"Fifty and eight years I have served
And from each blame myself preserved
As my testimonials show
And all, who know me, do well know."

یعنی بچاس سال مذکور ان کی خدمات اٹھاون سال کی ہو چکی تھیں۔ گویا ملازمت کی ابتدا ۱۸۳۴ء میں ہوئی۔ جس کا تمام تر تعلق انگریزوں ہی سے رہا۔ کیونکہ مدت مدید تک بحسن و خوبی خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش کر دئے جانے کی درخواست بھی انھوں نے انگریزوں کے قائم مقام اے جی جی کو پیش کی جو قصیدہ زیر بحث کے آخری بند میں بطریق ذیل قلمبند ہے ؎

"Please accept this my last request
As good as better and as best
No more than this I do require
My health desires me to retire
To pass my life in solitude
With thankfulness and gratitude
May god the omnipotent be
As kind to you as you to me."

جس سے ظاہر طور معلوم ہوتا ہے کہ دوران ملازمت وہ کبھی کسی رئیس کے ملازم بن کر نہیں رہے ورنہ درخواست سبکدوشی متعلقہ رئیس کو چھوڑ کر اے۔ جی۔ جی کو پیش نہ کرتے۔

جیسا کہ قصیدے میں ظاہر کیا گیا ہے۔ بہتر سال کی عمر میں ان کی جسمانی حالت تسلی بخش نہیں رہی تھی۔ کمزوری، اضمحلال، ثقل سماعت اور ضعف بصر کی شکایتیں لاحق ہو گئی تھیں۔ قصیدے کی زبان اگرچہ انگریزی ہے مگر خیالات اور تشبیہات و استعارات اس میں وہی استعمال کئے گئے ہیں جو اردو و فارسی میں متداول ہیں۔ مصنف نے خود اپنے طریق کار کو جدت سے تعبیر کیا ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزی لباس میں ہندوستانیت پھبتی نہیں مگر خوشی کے اس موقع پر کہ جب ہر چیز پر مسرت چھائی ہوئی ہے۔

"آثار الشعرائے ہنود" میں منشی دیبی پرشاد بشاش نے لکھا ہے کہ جانی جی نے تعلیم سے فارغ ہو کر "عرصہ تک سرکار انگریزی میں نوکری کی" جس سے مترشح یہ ہوتا ہے کہ ان کی ملازمت کی ابتدا محکمۂ فوج سے ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں معمولی ملازم کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے ہوں اور پھر ذہانت و صلاحیت کے سہارے رفتہ رفتہ ترقی کر گئے ہوں۔ نیز فوج کے نو ولایت افسروں کو پڑھانے کے فرائض ان کے سپرد کر دئے گئے ہوں کہ اس زمانے افسروں کو ایسے کارکنان کی شدید ضرورت تھی مگر بعید یہ بھی نہیں کہ ان کے ملازم رکھنے کا مقصد یہی رہا ہو۔

انگریز اپنے ہندوستانی معلموں کو "منشی" کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ نیز فوجی انگریزوں کو دیسی علوم پڑھانے والے بھی اسی نام سے پکارے جایا کرتے تھے۔ تعلق چونکہ ان کا بھی فوجی محکمے سے ہوتا تھا اس لئے قواعد و ضوابط کی پابندیاں فوجی دوسرے ملازمین کی طرح ان کے لئے بھی ناگزیر تھیں۔ بغرض تکمیل فرائض چھاؤنیوں میں ان کو رہنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوران ملازمت وہ جہاں جہاں متعین رہنا بتایا جاتا ہے۔ وہاں وہاں

انگریزی فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ چنانچہ اعظم گڑھ اور بنارس بھی اسی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ فاضل مؤلف "تلامذۂ غالب" نے جہاں سلسلۂ ملازمت ان کا قیام بتایا ہے۔

جانی جی کا ابتدائی عہد ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد تھا۔ انگریز آہستہ آہستہ اپنا اقتدار بڑھا رہے تھے۔ افسر بالعموم نو ولایت ہوا کرتے تھے۔ جانی جی نے اپنی محنت شاقہ اور غیر معمولی صلاحیتوں سے ان کو متاثر کر لیا۔ لہٰذا گوناگوں عزت و سرفرازی در جہ بدرجہ ان کو ملتی چلی گئی۔ درس و تدریس کے سلسلے میں ذی اقتدار حکام وقت سے سابقہ پڑا جس سے وہ ان کی نظر میں وقیع تر ہو گئے پہلے فوج سے ترقی پا کر نائب وکیل بھرت پور مقرر ہوئے جہاں ان کی خدمات اور بھی قابل قدر ثابت ہوئیں یہاں تک کہ انتظامی معاملات میں دخل دینے کا موقع ان کو مل گیا دیوان بھی بنا دئے گئے اور پھر وہاں سے وکیل بھرت پور اور مہاراجہ دھولپور کے اتالیق مقرر کر دئے گئے۔ بالآخر "راؤ بہادر" کے معزز خطاب سے ان کو سرفرازی بخشی گئی۔ یہ ان کی گرانقدر خدمات ہی کا اثر تھا کہ افسران کو عمر رسیدہ ہو جانے کے باوجود سبکدوش کر دینا نہیں چاہتے تھے۔

ریاست بھرت کے راجہ اس زمانہ میں راؤ ڈیسل جی تھے۔ ریاست میں دقیانوسی خیالات کا دور دورہ تھا۔ نرلیش اپنی حدود سے باہر قدم نکالنا بھی دستور کے خلاف سمجھتے تھے۔ محنت کا جبریہ لیا جانا اور ستی کی رسم بطور عام رائج تھی۔ انگریز ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ نیز ریاست میں اپنے اثر و اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے درپے تھے بلکہ ۱۸۵۳ء میں اس ریاست سے پہلا معاہدہ ہو بھی چکا تھا۔ پس جانی بہاری لال کو بحیثیت دیوان ریاست متعین کر دیا گیا۔ وہ چونکہ علمی حیثیت سے بھی خصوصی مرتبے کے حامل تھے۔ درس و تدریس انکی زندگی کا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ اس لئے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق ڈیسل جی کے صاحبزادے پراگ مل جی کی تعلیم و تربیت کا مقصد بھی ان کے ذریعے باحسن الوجوہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔

جانی جی جس زمانے میں بھرت کے عہدۂ دیوانی پر فائز تھے اسی زمانے میں انھوں نے دو زبان میں ایک منظوم کتاب کی تدوین کی ہے۔ نام اس کا "تعریف زبان فارسی و انگریزی" ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا مثنوی کی طرز پر بحر رمل سالم مثمن محذوف یا مقصور میں موزوں کی گئی ہے۔ تاریخی قطعے بھی اسی بحر میں ہیں سائز آٹھ صفحے ۱۸۶۹ء اور مطبع اعجاز محمدی آگرہ میں چھپی ہے۔ جو سو چالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ انگریزی زبان کی تعریف پر حاوی ایسے دوسرے حصے کے آخر میں منشی امین محمد حال دیوان راج بیکانیر المتخلص بہ صہبا"[1] کا کہا ہوا تاریخ اختتام کا منظوم ایک قطعہ شامل ہے جسکے دوسرے شعر میں جانی جی کا دیوان بھرت ہونا ظاہر کیا گیا ہے شعر یہ ہے ؎

واو گر جانی بہاری لال جی دیوان بھرت
آنکہ ہستا و نظیرش مادر گیتی نزاد

(باقی صفحہ ۴ پر)

[1] یہ وہ منشی امین محمد ہیں جن کی بابت مشہور ہے کہ مہاراجہ بیکانیر نے مرزا غالب سے فرمائش کی کہ وہ ایک قصیدہ (جو کہ نہ عربی کے شعر) لکھ دیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ قصیدہ (فارسی زبان میں) ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجنے کے لئے تیار کر دیں۔ مرزا صاحب نے ایک عرضداشت کا مسودہ تیار کر دیا اور وہ بھی "فارسی میں لکھ کر بیکانیر" ایک تحریر کے ساتھ روانہ کئے۔ اس تحریر کی اصل مولانا اطہر ابا پوری کے پاس محفوظ ہے۔ (جائزۂ زبان اردو۔ ص ۳۲۲ مرتبہ مولوی عبد الحق مطبوعہ انجمن مطبوعہ ۱۹۳۳ء)

آلِ احمد سرورؔ

کتابیں جو زندہ ہیں

دیوانِ غالب

غالبؔ نے زندگی کی تعریف اپنے ایک شعر میں کی ہے ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

گویا لوگوں کی نظر میں رہنا، انھیں دیکھنا اور اپنے آپ کو دکھانا، انھیں متاثر کرنا یاد آنا ہی زندگی کی پہچان ہے۔ صرف اسی معیار سے دیوانِ غالب ان کتابوں کی سرِفہرست ہے جو زندہ ہیں۔ یہ ایسی کتاب نہیں جس کا احترام سب کریں مگر پڑھیں کم جائے، یہ ایسی بھی نہیں جس کے متعلق ایک فیصلہ ہو چکا ہو جس میں ترمیم و اضافے کی گنجائش نہ ہو۔ یہ ایسی کتاب ہے جو زندگی کے ایک خاص موڑ پر یاد آئے اور پھر گزشتہ طاقِ نسیاں ہو جائے۔ جب سے دیوانِ غالب سامنے آیا ہے اس کی شرحیں برابر لکھی جا رہی ہیں۔ عاشق اس میں حسن کے سیکڑوں جلوے اور عشق کے ان گنت انداز دیکھتے ہیں۔ فلسفیوں کو اس کے اشاروں میں حکمت کی ایک داستان ملتی ہے۔ صوفی اس کے ذریعہ سے فنا اور بقا، ہستی و عدم کے رموز پہچانتے ہیں۔ محبانِ وطن کو اس میں تہذیب کے نقش و نگار اور شکست و فتح کا ایک آئینہ ملتا ہے۔ انسان دوستوں کے لئے اس میں نفسیات کے سیکڑوں اسرار اور شخصیت کے سیکڑوں گوہرِ آبدار ہیں اور جدید ذہن کے لئے کشمکش و اضطراب، تصادم و تلاش کے عجیب و غریب پہلو، آزاد خیالوں کے لئے شوخی کی کتنی ہی پھلجھڑیاں اور ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے والوں کے لئے یادوں کی کتنی ہی بزم آرائیاں۔ غرض غزل کے اشاروں میں زندگی کی داستان کے جتنے باب سما سکتے ہیں، چند سو اشعار کے اس چھوٹے سے دفتر میں آ گئے ہیں۔ دیوانِ غالب گویا زندگی کا الگ نظم کہا جا سکتا ہے جہاں اُسے پڑھنے کے لئے زندگی اور عاشقی کے آداب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

تو اور آرائشِ خمِ کاکل • میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

آرائشِ خمِ کاکل کو حسن کی ترجمانی کہہ لیجئے تو اندیشہ ہائے دور دراز غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ خمِ کاکل کی مصوری آسان ہے لیکن اندیشہ ہائے دور دراز کی پرچھائیوں کو الفاظ میں اسیر کرنا مشکل ہے۔ اس کے لئے جذبے کی گرمی کے علاوہ ذہن کی ورزش بھی ضروری ہے۔ بڑی شاعری جذبے کے آتش فشاں کا لاوا ہی نہیں، اس کی خاک پر افکار کے پھولوں کی جنت بھی ہے۔ غالب کے یہاں پھول و شبنم دونوں ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ وہی شاعری زندہ رہنے والی، یاد آنے والی اور دیر تک اور دور تک متاثر کرنے والی ہوتی ہے جس میں فکر اور جذبہ، عاشقی اور زندگی، خوابوں کی آئینہ سازی اور حقائق کی شیشہ گری، امیدوں کا نشہ اور ناکامیوں کی ترشی سب ملے ہوئے ہوں۔ غالب نے انسان کو جس عالم میں دیکھا تھا وہ عالم ہمیں آج بھی جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو وہ آج زیادہ حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی • وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی • عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی • ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز • میں ہوں اپنی شکست کی آواز

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کیا کیا خضر نے سکندر سے • اب کسے رہنما کرے کوئی

اس افسردہ و ستم رسیدہ، اپنی تدبیر سے شرمندہ اور اپنی تقدیر سے حزیں انسان میں کبھی کبھی یہ جرأت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حیاتِ کائنات پر آزادانہ اور بے باکانہ نظر ڈالتا ہے اور اپنے تخیل کے دام میں مہر و ماہ تک کو اسیر کر لیتا ہے۔ یہ دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھتا ہے۔ برق سے شمعِ ماتم خانہ روشن کرتا ہے۔ خاک سے پوچھتا ہے کہ تو نے میرے گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے، خدا سے سوال کرتا ہے کہ فرشتوں کے نامۂ اعمال لکھتے وقت ہمارا بھی کوئی آدمی تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو انسان ان دونوں پہلوؤں سے عبارت ہے۔ کبھی وہ مایوسی کے سمندر میں غوطے کھاتا ہے اور زندگی اسے ایک تاریک تنہائی لگتی ہے اور کبھی اس کے دل میں امید کی شمع روشن ہو جاتی ہے اور دنیا اسے جنتِ نگاہ فردوسِ گوش معلوم ہوتی ہے۔ صرف حزنیہ یا صرف طربیہ تصور یک رخا ہے خواہ اس کے پیچھے کتنی ہی گہری نظر کیوں نہ ہو۔ غالب کے دیوان میں ہمیں وہ دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے جو امید و ناامیدی، سرشاری و محرومی، عشرت و افسردگی، نغمہ و نالہ دونوں سے عبارت ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے • آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد • مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا • یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

ہوا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب • آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

زندگی کچھ مجبوریوں کا نام بھی ہے۔ جہاں بعض حقیقتوں کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ کوئی بُتِ کافر مہربان ہو بھی تو زیست کے کچھ اور ستم ہیں اور دکھ بھی ہیں۔ جان بھی عزیز ہوتی ہے۔ حسن کی رنگینیاں زندگی کی مسرت بھی ہوتی ہیں۔ منصور کا نعرۂ شوق کم ظرفی بھی ہو سکتا ہے۔

بہار نہ آئے تو بہار کی یاد تو ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر کیفیت اور ہر جلوے کی صداقت دیکھ سکتے ہیں۔ وہ محض عاشق ہی نہیں عارف بھی ہیں۔ وہ دیوانوں کے عشق کے پاؤں، حسن کی مظلومیت، بہار کی خزاں انجامی، آزردگی میں اندازِ جنوں، نالۂ غم میں ہنگامہ اور رونق، طاعت میں مے و انگبیں کی لاگ کا تصور کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمیں وسعتِ تخیل کو جولانی اور طبیعت کو ہمہ گیری سکھاتے ہیں۔ وہ صرف کرنوں سے سورج کا احساس کر لیتے۔ ہر حجاب کے پردے میں

ساز دیکھ لیتے ہیں۔ روزمرہ زندگی کے مظاہر، ادب، مذہب اور بے ربط چیزوں میں قانون قدرت اور نفسیات انسانی کا گہرا رشتہ پا لیتے ہیں اس لئے ہم ان کے یہاں ایک حکیمانہ نظر، ایک فلسفیانہ گہرائی، ایک مسلسل جستجو، سطحی رشتوں سے بلندی اور ایک وسیع وحدت سے وفاداری محسوس کرتے ہیں جو آج بھی اور بھی بھلی معلوم ہوتی ہے ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے ● مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ● ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب ● سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

ایک وسیع وحدت سے وفاداری، غالب کے یہاں انسانیت کے ایک اعلیٰ تصور کے ساتھ ایک ایسی شوخی بھی رکھتی ہے جو زندگی کے نشیب و فراز سے لطف اٹھا سکتی ہے اور کبھی کبھی اپنے اوپر ہنس بھی سکتی ہے۔ اسی شوخی کی وجہ سے غالب خدا اور خدائی دونوں سے کچھ چھیڑ چھاڑ بھی کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے زندگی کچھ اور گوارا معلوم ہونے لگتی ہے۔ غالب کے یہاں شوخی سے زیادہ کسی طنز تھی، زاہد پر طنز، رقیب پر پھبتی، اور دیر و حرم کی سختیوں سے کچھ آزادی کی کوشش۔ غالب کی شوخی میں ایک مہذب انسان کی نکتہ سنجی کے ساتھ سیاہی میں سفیدی، ظلمت میں نور، اور پرستش میں انا کی کارفرمائی دیکھنے کی جو کوشش ہے وہ بڑی پرلطف ہے۔ غالب اپنے کو دور دور سے دیکھ کر بھی اپنی کمزوریوں پر ہنس سکتے ہیں اور اس طرح شاعری کو زندگی کا ایک اور ذریعہ سے دیتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

تاب لائے ہی بنے گی غالب ● واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل ● بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد ● آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دیوان غالب میں ہمیں ایک جلوۂ صد رنگ ملتا ہے۔ غالب زندگی کے ایک جلوے، حسن کی ایک ادا، عشق کے ایک انداز کے پجاری نہیں، وہ اس کے ہر رنگ اور ہر نقاب کے محرم ہیں۔ انھوں نے حسن کی ساحری اور حسرت کی فسوں گری کے بھی بڑے حسین نقش و نگار پیش کئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے تمام سرد و گرم دیکھے تھے اور عشق کے دریائے خون سے بھی گزر رہے تھے۔ عاشقوں میں ان کا درجہ اور جو نہیں مگر خالص عشقیہ شاعری میں بھی وہ کسی سے کم نظر نہیں آتے۔ حسن کی مصوری دیکھئے ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

تھی وہ اک شخص کے تصور سے ● اب وہ رعنائی خیال کہاں

دیوان غالب اگرچہ انتخاب ہے مگر اس انتخاب کے سب اشعار یکساں بلند نہیں ہیں۔ اس میں ایسے اشعار بھی بہت سے ہیں جن میں صرف مضمون آفرینی اور نازک خیالی ہے مگر بے لطف اور بے مزہ اور کچھ دھول دھپے اور بیڑے کے اشعار بھی ہیں۔ بےشک شیکسپیر بھی اپنی پیاری کو لوطار کہتا ہے اور غالب اپنے دور سے یکسر بے پروا نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر جیسا کہ حالی نے کہا ہے ان اشعار میں غالب نے زندگی کے جتنے جلوے جذب کر لئے ہیں اور ان جلوؤں میں جو آب و تاب آج بھی ہے اس کی تشریح ایک مختصر صحبت میں بہت مشکل ہے۔

غالب جانتے تھے کہ زندگی ایک سید حادثہ اور ایک سہ فاروار، ایک عشق، ایک عبادت، ایک آنسو، ایک نظارہ نہیں؟ انھوں نے اس بساط پر آنکھ کھولی تھی جو مغلوں کی تہذیبی گلکاریوں سے چمن بنی ہوئی تھی مگر ان کی بالغ نظری کا ثبوت ہے کہ وہ اس بہار میں خزاں کی آمد دیکھ سکے اور ان کی آفاقیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آنے والی بہاروں کا تصور بھی کر سکے۔ ان کی گرمی نشاط تخیل نے انھیں عندلیب گلشن ناآفریدہ بنایا۔ وہ اپنے دور میں جانے مقبول تھے، گو انھوں نے ناقدری کا برابر رونا رویا ہے۔ مگر اس دور میں ان کی آزاد خیالی، ترقی پسندی، وسیع المشربی، رواداری، انسان دوستی، شوخی، نکتہ سنجی، حقیقت پسندی، مصورانہ گری، بلاغت اور جامعیت انھیں اردو کے تمام شاعروں سے زیادہ دلکش اور دلنواز رفیق بناتی ہے۔ یوں ان کے دیوان میں ہمیں قصیدے، مثنویاں، رباعیاں، قطعے سب کچھ مل جاتے ہیں اور "اے تازہ واردان بساط ہوائے دل" والا قطعہ تصویر کی عمومیت کے باوجود رنگوں کی شوخی کی وجہ سے بہت بڑا کارنامہ ہے مگر دراصل غالب نے غزل کو جو صرف من کی موج تھی، تخیل کی کرشمہ سازی اور ذہن کی نازک کاری کا ایک ایسا جوہری بم بنا دیا ہے کہ اس کا مسلسل ردعمل نئی ذہنی لہریں برابر پیدا کرتا رہتا ہے۔ بیسویں صدی کی عجیبہ اور پرآشوب دنیا کے ہر تجربے اور تحریک، اس کی ہر بلندی اور پستی کا گویا غالب کو پہلے سے اندازہ تھا۔ دیکھئے فضا کی پرواز کے لئے کیا بلیغ اشارہ ہے ؎

نہ پوچھ وسعت مے خانۂ جنون غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

اور اس رنگا رنگ دنیا کے لئے اس سے بہتر دستور العمل بھی کیا ہو سکتا ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ● ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بےخودی ● رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے
یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات ● عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

(شکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

شفا گوالیاری

غزل

بغیر شیشہ و ساغر پلا دے بے جھجک ساقی
سلامت یہ لبِ لعلیں یہ سانسوں کی مہک ساقی

سرِ میخانہ اشک و گل کی پھر ابھریں دھنک ساقی
کہ ہم دامن جھٹکتے ہیں تو زلفوں کو جھٹک ساقی

یہ کس کا عکس تھا اس میں یہ کس کے جام سے چھلکی
چمن سا کھل گیا جو میکدے سے چاند تک ساقی

یہ راہِ زندگی ہے جانے کیسا وقت آ جائے
ہماری بے خودی میں رکھ خودی کی بھی جھلک ساقی

یہ ممکن ہے ہمارے زخم خوردہ دل کی لغزش ہو
مگر کچھ ساغروں میں خون کی سی ہے جھلک ساقی

ابھر آئے شعاعِ صبح ایک اک موجِ ساغر سے
ابھی دیکھی کہاں تو نے غمِ دل کی چمک ساقی

الٹ جاتے ہیں کتنے ہی ورق تاریخِ عالم کے
ادائے خاص سے تیری جھپکتے ہی پلک ساقی

ذکی کو ناز ہو تیرے قد و گیسو کے سائے پر
بہاریں ہی بہاریں ہیں یہاں سے دور تک ساقی

مئے نو ڈھالتا ہے یہ شفق سے ماہ و انجم سے
شفا کی شاعری میں زندگی کی ہے کھنک ساقی

صبا اکبر آبادی

غزل

الفت میں اتنے داغ ملے ہیں کہ کیا کہوں
ایسے حسین پھول کھلے ہیں کہ کیا کہوں

یوں ضبطِ غم سے ہونٹ سلے ہیں کہ کیا کہوں
خاموشیوں میں اتنے گلے ہیں کہ کیا کہوں

ان کی ہر اک جفا کو نوازش سمجھ لیا
انعام وہ وفا کے ملے ہیں کہ کیا کہوں

مجھ سے زیادہ جیسے گریباں عزیز ہے
وہ یوں مرے جنوں کے گلے ہیں کہ کیا کہوں

دنیا سمٹ کے آ گئی آغوشِ شوق میں
کچھ اس طرح گلے سے ملے ہیں کہ کیا کہوں

لگنے لگا ہے اب تو مجھے چارہ گر سے ڈر
پھاہوں سے اتنے زخم چھلے ہیں کہ کیا کہوں

آئی کسی کی بخشش گستاخیٔ زخمِ دل صبا
یہ پھول اس ہوا سے کھلے ہیں کہ کیا کہوں

نوازش انصاری

تین شعر

دو قدم بڑھ کر خود ہی انھیں دیوانوں سے
عقل نازاں ہے جنھیں داخلِ زنداں کر کے

دلِ برباد سے پوچھے کوئی الفت کا مآل
کتنے غم پائے ہیں اک پیار کا ارماں کر کے

کم سے کم زیست رہی تھی اس سے عبارت اپنی
ہم پشیماں ہیں علاجِ غمِ پنہاں کر کے

شاہین غازی پوری

غزل

دنیا والو اپنی جھوٹی خواہش کی تسکین کرو
جتنا بھی جی چاہے میری چاہت کی توہین کرو

کب تک یوں مسموم رہو گے دکھ کے اوچھے وار سہو گے
لال گلابی سے چھا جا کر موسم کو رنگین کرو

دنیا کے غم کو اپنانا جی کو روگ لگانا ہے
زلفوں کے ٹھنڈے سائے میں اپنے کو بے دین کرو

دل کی آگ ہی بڑھ کر اک دن نارِ جہنم بنتی ہے
دل والو تسکینِ تمنا آؤ بعد تلقین کرو

چاند کی آبادی سے کیا ہے چاند تو اک ویرانہ ہے
کیوں چہرے کو دیکھ کے دل کا اندازہ شاہین کرو

داور آفریدی

غزل

جیسی چاہو بنا دو مری زندگی
میرے غم کے لئے ہے تمہاری خوشی

بات میں نے جہاں مان لی آپ کی
مختصر ہو گئی ہے وہیں زندگی

اس کو تپتی ہوئی دھوپ کی کیا خبر
جس کی تقدیر میں چھاؤں آئے کبھی

دل میں کیا ان گنت میرے ارمان ہیں
جیسے راتوں میں ہو رات تاروں بھری

تیرے ہر اک ستم کو بھلا تو دیا
یاد باقی ہے لیکن تری آج بھی

ختم روداد یا ختمِ فکر و نظر
تیرے زانو پہ سر تھا کہ نیند آ گئی

وصی سیتاپوری

غزل

جس کو رونا تھا خون کے آنسو
بات کیا ہے وہ آنکھ نم بھی نہیں

یہ الگ بات وہ نہ ہوں محسوس
ورنہ غم زندگی کے کم بھی نہیں

میں سمجھتا ہوں تیری شانِ عطا
اب مجھے فکرِ بیش و کم بھی نہیں

میکدے سے نکل کے جاؤں کہاں
سامنے اب وہ حرم بھی نہیں

جانے کیا ہو گیا وصی دل کو
یاد اب لذتِ الم بھی نہیں

طلعت شبلی

غزل

زمیں ہے خاکِ پا نقشِ قدم ہے آسماں میرا
ہے مہر و ماہ و انجم سے بھی آگے کارواں میرا

وہ فصلِ گل ہے جس میں دشت و صحرا لہلہاتے ہیں
یہ فصلِ گل نہیں جلتا ہے جس میں گلستاں میرا

نگاہِ ناز کی ہے شرح میری اشک افشانی
کہانی آپ ہی کی ہے فقط طرزِ بیاں میرا

میں روحِ عالمِ امکاں میں شرحِ عظمتِ یزداں
ازل ہے میری بیداری ابد خوابِ گراں میرا

چلو صحرا کے ذروں کو شریکِ گفتگو کر لیں
چمن میں تو نہیں شبلی کوئی بھی ہم زباں میرا

مراسلات

اُردو کے اہم مسائل

بزم اُردو ایس بی کالج گلبرگہ نے پہلے کیا ہے کہ ماضی کی بہترین روایات کو قائم رکھتے ہوئے سال رواں میں نہ صرف تہذیبی جلسے کئے جائیں بلکہ سمپوزیم اور مقالوں کی روایات کو بھی مقبول بنایا جائے۔

ہماری آرزو ہے کہ مقالوں کا معیار قومی سطح کا ہو۔ ظاہر ہے یہ کام ناممکن ہوگا۔ اگر ہم اپنے ملک کے نامور ادیبوں اور دانشوروں کی شرکت کی توقع کریں عملاً نہ ان دانشوروں کے لئے ممکن ہے اور نہ ہمارے لئے۔ کیونکہ دور دراز سے ان مہمانوں کو بلانے کی ہم میں سکت نہیں ہے۔ البتہ ہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ ملک کے سارے نامور ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دانشوروں سے درخواست کریں کہ وہ ہمیں از راہ کرم اپنا قیمتی مقالہ، مضمون یا کم سے کم علم افروز پیغام عنایت فرمائیں۔ ہم پہلے انھیں اپنے سمپوزیم اور مقالات کے سالانہ جلسہ عام میں سنائیں گے اور اس کے بعد اپنے کالج میگزین میں بھی چھاپیں گے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ کی ذرا سی نظر عنایت سے ہم ایک نئی جاندار اور مقصدی روایت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہم طلباء محسوس کرتے ہیں کہ کسی زبان کے ارتقاء کا مسئلہ اسکے بولنے والے عوام کے تہذیبی اور سماجی ارتقاء کے مسئلے سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ مگر اردو زبان کے تعلق سے یہ بات بڑی انوکھی ہے کہ اردو زبان کے ترقی کے مسائل کچھ اور ہیں اور اردو بولنے والے عوام کے مسائل کچھ اور نظر آتے ہیں۔ اس تضاد کے اسباب کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے۔ یہ آج کا بنیادی مسئلہ بن گیا ہے جو نہ صرف اردو زبان پر اثر انداز ہے بلکہ ہماری ساری تہذیبی ترقی کے لئے بھی رکاوٹ بن سکتا ہے۔

ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ نئی نسل کے لئے اور نئے تقاضوں کے لئے اپنا تھوڑا سا قیمتی وقت ہمیں دیجئے۔ اور ان مسائل پر اپنے قیمتی خیالات سے ہمیں اپنی اولین فرصت میں نوازئے۔

اُردو زبان کے مسائل مختلف ریاستوں میں مختلف بھی ہیں اور مشترک بھی۔ مثلاً اترپردیش اور بہار وغیرہ میں اُردو زبان کا مسئلہ حکومتی پالیسی کا مسئلہ ہے مگر مدھیہ پردیش مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور میسور وغیرہ میں یہ مسئلہ اور زیادہ گہرا ہے، کیونکہ ان ریاستوں کی علاقائی زبان اردو سے مختلف ہے۔ مثلاً حکومت میسور نے یکم اگست ۱۹۶۱ء سے لازمی تعلیم کی اسکیم جاری کی ہے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں گاؤں میں لازمی تعلیم کا آغاز ہوا ہے مگر ہمارے ان شہروں کو چھوڑ کر ان اسکولوں میں کنڑا ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے اُردو کی پڑھائی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر اُردو زبان کی ترقی کے مسئلے کی، اُردو زبان بولنے والوں کی سماجی اور تہذیبی شعور سے ٹکر ہوتی ہے۔ اُردو زبان والے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مادری زبان میں ابتدائی جماعتوں سے ثانوی جماعت تک گاؤں گاؤں میں تعلیم کے لئے اُردو اسکول اور جماعتیں کھول دی جائیں۔ اس کے برخلاف غیر جانبدار اور ہمدرد لوگ کہتے ہیں کہ اُردو ایک زائد زبان کی طرح اسکولوں میں پڑھانے کے مطالبہ سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے وغیرہ۔ مگر اس تعلق سے اُردو کے نمائندہ ادیب اور دانشور تقریباً خاموش ہیں۔ اس طرح قومی زندگی میں اُردو عوام کی علیحدگی پسندی دن بدن سماجی اور تہذیبی زندگی سے انھیں دور دھکیل رہی ہے جس کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ اور بدنامی آخرکار اُردو کی ہی ہو رہی ہے۔

ہم آپ سے گذارش کرتے ہیں کہ براہ کرم حسب ذیل مسائل پر آپ بحیثیت ادیب یا افسانہ نگار یا شاعر یا نقاد یا دانشور یا صحافی (کسی بھی حیثیت سے) روشنی ڈالئے اور اپنا قیمتی مضمون مقالہ یا کم از کم ایک معلومات آفریں پیغام ہی ہمیں روانہ فرما کر ممنون فرمائیے۔

مقالہ کا عنوان اور اس کے پہلو: (۱) اُردو زبان کے مسائل (بشمول تعلیم، رسم الخط، عروض، اور صحافتی مسائل کے)

(۲) اُردو زبان کے مسائل اور اُردو بولنے والے عوام کے مسائل میں تضاد کیوں ہے۔ اس کے اثرات کیا ہو سکتے ہیں اور ان کا حل کیا ہے۔

(۳) اُردو زبان کی بنیادی بین الاقوامیت کو باقی رکھنے کے لئے اُردو اور دوسری زبانوں سے اشتراک رکھنے کے لئے کیا کیا جانا چاہیے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنا قیمتی مقالہ مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۶۱ء تک ذیل کے پتہ پر روانہ فرما کر ہمیں ممنون فرمائیں گے۔

گلبرگہ۔ مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء

پتہ: خواجہ معین الدین، معتمد بزم اُردو ایس بی کالج گلبرگہ (میسور)

انجمن کا خبرنامہ

ایک اچھی خبر

ریاست میسور کی انجمن ترقی اردو کی ہماکی شاخ گلبرگہ نے ریاست کے محکمۂ تعلیم سے درخواست کی تھی کہ ان طلبہ کے لئے جن کی مادری زبان اردو ہے، اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے اور مدارس میں ایسے طلبہ کے لئے اردو پڑھانے کا معقول انتظام کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ محکمۂ تعلیم نے اپنی حق پسندی اور منصف مزاجی سے ان کی درخواست کو حق بجانب قرار دے کر عمل درآمد شروع کر دیا ہے اور انجمن کی شاخ کو درجے کھول دینے کی اطلاع دے دی ہے۔ چند خاص نام یہ ہیں :-

جی۔ سی۔ پرائمری اسکول مومن پورہ؛ جی۔ پی۔ اسکول جنجولی؛ جی۔ سی۔ پی۔ اسکول کیم بھادی؛ جی۔ پی۔ اسکول پٹساگی؛ جی۔ پی۔ اسکول ضلع پیٹھ؛ ہائی اسکول شاہ آباد؛ ہائی اسکول ضلع گج؛ ہائی اسکول گنیانی؛ ہائی اسکول جنجولی؛

یادگارِ انیس کمیٹی، لکھنؤ کی جانب سے قدرشناسانِ انیس کی خدمت میں

اپنے مشاہیر کی یادگار قائم کرنا زندہ قوموں کا شعار بلکہ قوموں کی زندگی کا ثبوت ہے۔ حامیانِ اردو کی یہ غفلت شعاری کس قدر افسوسناک ہے کہ اپنے بڑے سے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی یادگار قائم کرنے کا کیا ذکر اُن کے مسکن و مدفن کا نشان تک باقی نہ رکھ سکے۔ غنیمت ہے کہ فردوسی ہند میر انیس کا مزار، ان کی شاندار محل سرا اور دیوان خانہ خستہ و شکستہ حالت میں ابھی تک قائم ہیں لیکن اگر کچھ دن اور اُن کی طرف سے غفلت برتی گئی تو اُنکے آثار بھی مٹ جائیں گے اور ہمارے دامن پر ایک بڑا بدنما دھبہ اور لگ جائیگا۔ اسی احساس کی تحریک سے یادگارِ انیس کمیٹی وجود میں آئی ہے جس کے عہدہ دار حسب ذیل ہیں :-

صدر۔ سید علی ظہیر بیرسٹر ایٹ لا (سابق وزیر حکومت ہند و حکومت اترپردیش)

نائبانِ صدر۔ (۱) پنڈت آنند نرائن ملا (جج الہ آباد ہائی کورٹ)

(۲) سید مصطفیٰ حسن آئی سی ایس (ریٹائرڈ ممبر بورڈ آف ریونیو یو۔پی)

جنرل سکریٹری۔ سید علی عباس حسینی (سابق پرنسپل گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول حسین آباد، لکھنؤ)

مہتمم نشر و اشاعت۔ مرزا رضا حسین (سابق ڈپٹی کلکٹر لے۔ ڈی۔ ایم ساگر، مدھیہ پردیش)

خازن۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب (سابق پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی و اردو، لکھنؤ یونیورسٹی)

اس کمیٹی نے شاعر اعظم میر انیس کا مزار اُن کے شایان شان تعمیر کرنے اور ان کی محل سرا اور دیوان خانہ خرید کر اور ان کی مرمت کرکے اصل صورت میں ایک قومی یادگار کی حیثیت سے محفوظ رکھنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے کم سے کم پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے جو قدرشناسانِ انیس کی تعداد کو دیکھتے ہوئے کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ اُن کی ادنیٰ توجہ سے یہ رقم بآسانی فراہم ہو سکتی ہے۔

انیس نے اردو شاعری کو "تنگنائے غزل" سے نکال کر بے پایاں وسعت بخشی۔ قدرت نے اُن کو تفکر، تخیل، مشاہدہ اور بیان کی جو عدیم المثال قوتیں عطا کی تھیں اُن سے کام لینے کے لئے انھوں نے واقعۂ کربلا کا سا عظیم موضوع منتخب کرکے رزمیہ، رثائیہ، بیانیہ اور اخلاقی شاعری کے میدانوں میں جو معجز نمائیاں کی ہیں، اُنھوں نے ہماری شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ سرتاسر صداقت پر مبنی ہے :

سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر ٭ مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

یاد رکھئے کہ مزارِ انیس صرف انیس کی یادگار نہ ہوگا بلکہ خاندانِ انیس کے اُن تمام افراد کی یادگار ہوگا جو اپنی عمریں شاعری اور مرثیہ گوئی میں صرف کرکے اپنے بزرگِ خاندان کے پہلو میں محو خواب ہیں یعنی انیس کے ایک بھائی مونس؛ تین بیٹے نفیس، رئیس، سلیس؛ تین پوتے عروج، جلیس، قدیم؛ ایک پرپوتے فائز؛ ایک نواسے مانوس اور اُن کے دو بیٹے واصف اور واثق اور ایک بھانجے ذکی؛ نفیس کے نواسے عارف اور اُن کے بیٹے فائق۔ وہ قطعۂ آراضی جس پر مزارِ انیس تعمیر کیا جا رہا ہے اُس پر یہ شعر پورے طور پر صادق آتا ہے۔

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مزارِ انیس کی تعمیر شروع ہو چکی ہے مگر اس کی تکمیل آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ تو دستِ کرم بڑھائیے، اپنے احباب سے مالی امداد دلوائیے اور جو ذرائع آپ کے امکان میں ہوں اُن سے کام لے کر مطلوبہ سرمایہ جلد فراہم کیجئے۔

رقوم عطیہ مندرجہ ذیل پتے پر روانہ فرمایئے

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب خازن یادگار انیس کمیٹی ادبستان۔ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

(سید علی عباس حسینی، جنرل سکریٹری یادگارِ انیس کمیٹی لکھنؤ)

علامہ سید علی اصغر بلگرامی کی یاد میں جلسۂ تعزیت

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے ملک کے نامور محقق اور ماہر دکنیات سید علی اصغر بلگرامی کے سانحۂ ارتحال پر ۲۹ اکتوبر شام کے ۶ بجے ایوان اردو میں ایک جلسۂ تعزیت پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر اکبر الدین صدیقی، قمر ساحری اور پروفیسر ہارون خاں شروانی نے ان کے علمی کارناموں اور خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور قرارداد تعزیت پیش کی گئی جسے حاضرین نے استادہ ہو کر منظور کیا۔ (وقار خلیل)

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا تعزیتی جلسہ

۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا جلسۂ تعزیت بسلسلۂ انتقال پنڈت سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، ہیرا لال ورما ایڈوکیٹ صدر انجمن کی صدارت میں جناب مقبول احمد لاری صاحب کے مکان پر منعقد ہوا۔ جلسے میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی جنرل سکریٹری انجمن، مولانا محمد یونس خالدی نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ حسب ذیل تجویز تعزیت پیش ہو کر پاس ہوئی۔

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا یہ جلسہ پنڈت سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کی موت پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ نرالا جی نہ صرف ہندی کے ایک بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے بلکہ ہندوستانی ادب کے دور جدید میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔ وہ ہندی کے علاوہ بنگلہ، انگریزی اور سنسکرت سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کی مدد سے انھوں نے ہندی ادب کے دامن کو بہت وسیع کیا۔ ان کی شاعری نے صرف فن میں ہی نئی راہیں نہیں کھولیں بلکہ اپنے زبردست قومی جذبے کی عکاسی کر کے ہندوستان کی سیاسی بیداری اور سماجی اصلاح میں بھی زبردست حصہ لیا۔ یہ جلسہ نرالا جی کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ (سکریٹری)

ہری ہانس میں انجمن ترقی اُردو کی نشست

ہری ہانس، ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۱ء ۸ بجے صبح گاندھی لائبریری کے ہال میں انجمن کی دوسری نشست ہوئی۔ جنرل سکریٹری نے میٹنگ کی روداد پیش کی جو باتفاق رائے منظور ہوئی۔ کمیٹی کی گزشتہ نشست کے مقابلے میں نئے ممبران کی تعداد میں قدرے اضافہ ہوا۔ اس حالیہ نشست میں انجمن کے ممبران نے مندرجہ ذیل باتوں پر خاص طور سے تبادلہ خیال کیا۔

(۱) انجمن کی ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کیلئے معاشی امداد باہمی۔

(۲) انجمن کے ذریعہ عوام میں تہذیبی اور ادبی سرگرمی پیدا کرنے کی کوشش۔

(۳) انجمن کی ترقیاتی اسکیم کے تحت ایک ماہ میں دو ادبی مجالس منعقد ہوں گی جن میں محبان اُردو مختلف طریقوں (تحریری اور تقریری) سے اپنی استعداد علمی کا مظاہرہ کریں گے۔ کمیٹی کے اس پروگرام میں مشاعرہ، مباحثہ اور ادبی انعامی مقابلے کی تجویزیں کثرت آراء سے منظور ہوئیں۔ (سبحان احمد۔ ادیب، سکریٹری)

بزم ادب رانی پورہ اندور کی ادبی نشست

اندور۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۱ء۔ مقامی بزم ادب رانی پورہ اندور کی جانب سے ایک ادبی نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت کے فرائض نوجوان شاعر ظفر احمد نظامی نے انجام دیے۔

نشست میں مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

(محمود نشتر تقی۔ بزم ادب رانی پورہ)

تمل ناڈ اُردو مجلس ترچناپلی کا جلسۂ انتخاب

۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۱ء بروز اتوار شام کے ۶ بجے زیر صدارت جناب ڈاکٹر ٹی امیر الدین احمد صاحب صدر مجلس، تمل ناڈ اُردو مجلس مرکزی کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں نئے سال کے لئے عہدیداروں کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ مندرجہ ذیل احباب منتخب ہوئے۔

صدر: ڈاکٹر ٹی امیر الدین احمد صاحب۔

نائبین صدر: جناب اسمٰعیل سید بشیر الدین احمد صاحب۔ جناب ڈی فضل الرحمٰن خاں صاحب۔ بیگم سعید صاحب۔

معتمد عمومی: جناب شہاب صاحب۔

نائبین معتمد: جناب سید حسین الدین صاحب۔ جناب ایم۔ اے رحیم صاحب۔ پنڈت چناتن صاحب۔

خازن: جناب ایچ محمد قاسم صاحب ایڈوکیٹ۔

ان عہدیداروں کے علاوہ تیس احباب پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی کی بھی تشکیل ہوئی جس میں مقامی احباب کے علاوہ مجلس کی مختلف شاخیں مدراس۔ کرور۔ تجاور اور سیلم کے نمائندوں کو بھی شامل کیا گیا۔

اجلاس شب میں ٹھیک دس بجے معتمد عمومی کے اظہار تشکر پر اختتام کو پہنچا۔ (سید حسین الدین)

انجمن ترقی اُردو شاخ کامٹی کی ماہانہ ادبی نشست

۲۹ر اکتوبر کو انجمن ترقی اُردو کامٹی کی ماہانہ ادبی نشست زیر صدارت پنڈت گورداس رام صاحب سوز ہوشیارپوری، صدر انجمن بوقت دس بجے منعقد ہوئی۔ نشست کا افتتاح جناب ناظم انصاری کے مزاحیہ کلام سے ہوا۔ بعد ازاں حسب ذیل حضرات نے اپنی تخلیقات سے سامعین کو نوازا۔

عبدالرب عرفان، یونس افسر، پروفیسر قمر التوحید صاحب، جناب شاہد کبیر، عبدالرحمٰن راہی، وقار صدیقی، ڈاکٹر ندھیر صاحب، شمس کامٹوی صاحب، مولوی محمد سعید اعجاز صاحب، شاطر حکیمی صاحب، ناظم انصاری، حمید ناگپوری، پنڈت گورداس رام سوز صاحب۔

نشست بارہ بجے شب میں ختم ہوئی۔

(ظہیر الحسن سکریٹری)

ادبی سرکل احمد آباد

مورخہ ۲۴ر اکتوبر ادبی سرکل احمد آباد کی پندرہ روزہ نشست پروفیسر وارث حسین علوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ رحمت امروہوی نے اپنی نظم "نقاد سے" سنائی۔ سرشار بلند شہری نے نظم "میر گھر" سنائی۔ جمیل کلیمی، بشیر احمد زخمی، اقبال فتحپوری نے غزلیں پیش کیں۔ تمام تخلیقات پر تنقید و تبصرہ ہوا۔ آخر میں پروفیسر وارث حسین علوی نے اپنا ڈرامہ "مکان برائے فروخت" سنایا جو کافی پسند کیا گیا۔ (عادل منصوری جوائنٹ سکریٹری)

اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس

اُردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس ۲۹ / اکتوبر کو ۵ بجے شام اُردو ہال واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ ریڈر شعبہ ہندی جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر راج کشور پانڈے نے اس جلسے کی صدارت کے لئے رائے جانکی پرشاد صدر اُردو مجلس نے استدعا کی۔ سب سے پہلے جناب مولوی نصیرالدین ہاشمی نے علامہ سید علی اصغر بلگرامی کی یاد میں اپنا مضمون سنایا۔ ازاں بعد جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد اُردو مجلس نے علامہ بلگرامی کے سانحۂ ارتحال پر قرارداد تعزیت پیش کی۔ حاضرین نے ایستادہ ہو کر دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ اسے منظور کیا۔

اس کے بعد "کبیر داس کے دوہے" کے زیر عنوان نجم آفندی نے اپنا گراں قدر مقالہ سنایا اور کہا کہ "کبیر ہندی بھاشا کے شاعر تھے، ان کے کلام میں توحید کی تبلیغ، شرک کی مذمت، جھوٹے ویراگ کی مخالفت، سنتوش کی تعلیم، بھیک مانگنے کی برائی، حلم اور تواضع کا درس، سچائی کی خوبیاں، غیبت، بدگوئی اور عیب بینی کی مخالفت ملتی ہے۔ تصوف اور ایشور بھگتی کے جذبوں ہی سے کبیر کی شاعری کا خمیر اٹھا تھا۔" نجم نے کہا کہ گو کبیر لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے مگر اپنی شاعری کا وہ ایسا نقش چھوڑ گئے جو بہت پڑھے لکھے شاعروں کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔ کبیر کے دوہوں میں ہلکے پھلکے اور عام فہم الفاظ ملتے ہیں، اسی سبب ان کے دوہے ہندی شعراء کے دوہوں سے مقبول ہوتے۔ نجم نے دوہوں سے کئی مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ کبیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرقہ بندی کے سخت مخالف تھے ان کے کلام میں اخلاقی درس زیادہ ملتا ہے اور عاشقانہ رنگ بہت کم جھلکتا ہے۔

کبیر کی فارسی دانی کا ذکر کرتے ہوئے نجم آفندی نے بتایا کہ وہ فارسی زبان اور فارسی شعراء سے بے حد متاثر تھے۔ اسی سبب ان کے کلام میں کئی فارسی الفاظ ملتے ہیں۔ کبیر داس کی سب سے بڑی خصوصیت جو انھیں دوسرے ہندی شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے غزل کی بنیاد رکھی، یہ اُردو کے سب سے پہلے غزل گو کہے جا سکتے ہیں۔ "بھجناولی" میں ان کی ایک نظم جو بھجن کے نام سے شامل ہے تغزل کا پورا مزاج رکھتی ہے۔ خصوصاً یہ دو شعر ؎

ہمیں ہے عشق مستانہ ہمیں کو ہوشیاری کیا
ہے آزاد یا جگ سے ہمیں دنیا سے یاری کیا
کبیرا عشق کے ناتے دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے ہمیں سر بوجھ بھاری کیا

نجم کے اس پر از معلومات مقالہ کے بعد محفل شعر و سخن میں بانو طاہرہ سعید، عزیز اقبال، وقار خلیل، صادق نقوی، ساجد رضوی، کیف رضوانی، مرزا عابد عاصم، عباس عابدی اور سراج صاحبان نے اپنا کلام پیش کیا۔ ملک کے ممتاز موسیقار جناب ایم۔ اے۔ رؤف نے سازوں پر بھجن اور چند غزلیں سنائیں۔ آخر میں ڈاکٹر راج کشور پانڈے نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے اُردو مجلس کے ادبی جلسوں کو خراج تحسین ادا کیا اور کہا کہ "کبیر نے عوام کی زبان میں جو بھجن چھاپا ہے کہیں انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عوام میں زندگی کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پوجا پاٹ عبادت سے کبیر نے لوگوں کو کبھی نہیں روکا۔ اگر انھوں نے کبھی مندر یا مسجد کے خلاف بھی لکھا ہے تو اس کا مقصد تھا کہ لوگ پوجا پاٹ عبادت کی اصل روح سے آشنا ہوں۔ کبیر نے آج سے سیکڑوں سال پہلے اس بات کا بڑی بیباکی سے اعلان کیا کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ہیں اور ہر شخص کو دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا چاہیئے۔ انکی شاعری دل سے نکلے درد کا نتیجہ ہے اسی لیے اس میں تاثیر ہے۔ ان کا پیغام پریم، محبت، صلح و آشتی اور بھائی چارہ کا تھا۔ (محمد منظور احمد معتمد اُردو مجلس)

گجویل میں اُردو کی پانچویں جماعت کا قیام

حیدرآباد۔ ۳۰ / اکتوبر ۹۱ء

مسٹر ابراہیم، ڈپٹی صدر پنچایت سمیتی گجویل نے مدرسہ نسواں گجویل میں اُردو ذریعہ تعلیم کی پانچویں جماعت کو بحال کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ۲۹ / اکتوبر سے اس جماعت میں پھر سے تعلیم کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر جی۔ سریواستو معتمد انجمن تحفظ اُردو آندھرا پردیش نے گجویل پہنچکر صدر پنچایت سمیتی اور مقامی اُردو بولنے والوں سے بات چیت کی تھی۔ سمیتی نے یقین دلایا کہ آئندہ سال اس مدرسہ میں اُردو ذریعہ تعلیم کی چھٹی جماعت بھی قائم کی جائیگی۔ (سیاست)

انجمن ترقی اُردو ونانڈیڑ کی ماہانہ اُردو مجلس

انجمن ترقی اُردو کی ماہانہ اُردو مجالس جو پچھلے چار پانچ مہینوں سے بند ہو گئی تھیں، اب پھر ان مجالس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی اُردو مجلس بتاریخ ۲۷ / اکتوبر اتوار ۱۰ بجے صبح دارالمطالعہ ہال چوک میں منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب ابو الظہر صہبا، صدر بزم شعر و ادب پورھنی نے کی۔ محمود عشقی جنرل سکریٹری نے انجمن کی رپورٹ سنائی اور انجمن کی سرگرمیوں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا۔

م۔ رخ۔ شاذلی نے اپنا افسانہ "صید رسنگیت" پڑھا۔ جس پر رفعت نواز، صہبا، فخر الزماں نے تنقیدی تبصرے کئے۔ رفعت نواز نے "صید رسنگیت" افسانے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ... منظر کی تصویریں ... تصور ہوتا ہے وہ اس کے جمالیاتی شعور کی غمازی کرتا ہے۔ اس افسانے میں بھی ایک عظیم موسیقار کے فن اور اسکے جمالیاتی تجربات کو ... پیش ... ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے مرکزی کردار ... سے انصاف کیا ہے۔

"رفعت نواز" نے ایک افسانہ "وہ کون تھا" پڑھا جس کا مرکزی خیال انگریزی کی کہانی سے لیا گیا تھا۔

ابو الظہر صہبا نے رفعت نواز کے افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کہانی کا مرکزی خیال دوسری زبان کی کہانی سے لیا گیا ہے مگر افسانہ نگار نے بڑی خوبی سے اسکو اپنے ماحول سے مطابق کر دیا ہے جس سے وہ طبعزاد لگتی ہے اور ایسی ہلکی پھلکی کہانیوں کی ہمیں قدر کرنی چاہیئے۔ محمود عشقی نے اپنی ایک غزل سنائی۔ محمود عشقی کے بعد ... ثاقب ... رحمن ... نسیم حیدرآبادی اور صدر مجلس ابو الظہر صہبا نے اپنا کلام سنایا۔ جنرل سکریٹری کے شکریہ پر مجلس ۲ بجے ختم ہوئی۔

(محمود دعجاز۔ معتمد نشر و اشاعت)

بقیہ

دیوان جانی بہاری لال راضیؔ بھرتپوری

صہبا نے اسی قطعے میں بہ تعمیہ "دل خوش" "فیض اثر" عام بادہ سے تاریخ بکرمی بہم پہنچائی ہے۔ مادہ ۱۹۱۰ کا حاصل ہے جس میں دل خوش یعنی داؤ کے چھ عدد شامل کرنے پر مطلوبہ سال بکرمی ۱۹۱۶ نکل آتا ہے، اور ستاون اس میں سے کم کر دینے پر ۱۸۵۹ سن عیسوی کے اعداد برآمد ہو جاتے ہیں، جو ہجری سال ۱۲۷۰ کے مطابق ہیں۔ یہ حصہ صفحہ ۳۴ سے شروع اور صفحہ ۲۳۰ پر ختم ہوتا ہے۔ شعر اس میں چار سو دو ہیں۔

پہلے حصے میں جو صفحہ ۱ سے صفحہ ۳۴ تک محیط ہے، فارسی اشعار سے بحث کی گئی ہے یہ ۲۱۸۔ اشعار پر مشتمل ہے اس کے اختتام کی صوری و معنوی تاریخ خود مصنف نے کہی ہے جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

لکھ کے اسکو فکر میں تاریخ کی تھا غوطہ زن • کہ تریں جانی بہاری لال ناگر برہمن
ناگہاں ہاتف نے یہ مژدہ دیا از رُوئے داد • گر خوشی اسکے حساب عیسوی سن کر کے یاد

لکھ یہی تاریخ اس کی بے بدل تو راضیا
ہے ربیع الثانی بارہ سو چہتر سال کا

۵۰ عیسوی ۱۸

فارسی و انگریزی دونوں حصوں میں گردانیں جدولوں میں درج کی گئی ہیں نیز انگریزی الفاظ کو بخط انگریزی اُردو الفاظ کے نیچے لکھ دیا گیا ہے اور مثالوں میں استناد دہلی کے ارباب شعراء سے کیا گیا ہے۔

فاضل مؤلف "تلامذۂ غالب" نے ۱۲۶۲ھ میں مطبع دربار بھاولپور سے راضی کے دیوان کا شائع ہونا بتایا ہے جس سے زمانہ زیر بحث میں راضی کا مذکورہ علاقے میں موجود ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ بھرتپوری ایک شاعر کا مقامی اور پاس پڑوس کے مطبعوں کو چھوڑ کر وہاں اپنے دیوان کا چھپوانا جہاں صحت کے ساتھ اُردو زبان کے بولنے والے بھی خال خال ہوں گے، قرین قیاس نہیں۔ اس عہد میں آگرہ طباعت کے کام کے لئے دور دور مشہور و مقبول تھا۔ دہلی اور بھوپال تک کی کتابیں آگرے میں چھپی ہیں۔ نیز راضی کی دوسری تصانیف پیش نظر بھی آگرے ہی کی مطبوعہ ہیں۔ کیونکہ کچھ سے فارغ ہونے کے بعد ان کا زمانہ بھرتپور یا اسی کے آس پاس کے علاقے میں گزرا ہے۔ پس بہ نظر صورت واقعات اس نتیجے پر پہنچنا غلط نہیں کہ ان کا دیوان کچھ رہنے کا زمانہ کم سے کم ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۲ء تک یقیناً محیط رہا۔

گزیٹیر نیز یورپی مصنفین کی دیگر تالیفات میں ریاست کچھ کے مذکورہ بالا عہد کو عہد زریں سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا تمام تر انحصار میرے خیال میں دیوان ریاست کی فہم و فراست، خوش انتظامی اور تدبر و دانائی پر ہونا یقینی ہے۔ یہ جانی جی کی ہم نشینی کا ہی اثر تھا کہ پراگ مل جی ولیعہد کچھ نے قدیم خیالی کو خیر باد کہہ کر انگریزی تعلیم حاصل کی، نامناسب پابندیوں کو ترک کیا اور نمایاں اصلاحوں کے ذریعے اپنے علاقے کو فروغ دے کر تاریخی یادگار رہ گئے نیز قدر علمی اور ارباب قلم تک سے خراج تحسین حاصل کرنے میں کامیاب مرجع شاہ بہت ہوئے اور خطابات پائے۔

جانی جی کب تک دیوان کچھ رہے، ریکارڈ پیش نظر سے علیحدگی اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ تعلق کے ساتھ یہی معلوم ہوا کہ وہ کچھ کے بعد کہاں متعین کئے گئے۔ آثار و قرائن البتہ بتاتے ہیں کہ وہاں سے وہ بھرتپور آئے کہ پہلے یہیں نائب وکیل کے عہدے پر فائز تھے جواہر کہ ۱۸۵۳ء میں بھرتپور رئیس بلونت سنگھ جی کا دیہانت ہو گیا جن کو ۱۸۲۶ء میں انگریزوں نے گدی پر بٹھایا تھا[1]۔ اس وقت کے ان کے ولیعہد مہاراجہ جسونت سنگھ صرف تین سال کے خورد سال بچے تھے۔ اس لئے ریاست کا انتظام پولیٹکل ایجنٹ اور سات سرداروں کی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا[2]۔ چنانچہ Native chiefs & Their States[3] کے صفحہ ۲۰ پر مرقوم ہے کہ:-

"During his minority The administration was carried on by a political agent and council of seven sirdars."

اُدھر دیسل جی کے بعد جولائی ۱۸۶۰ء میں ان کے صاحبزادے پراگ مل جی راج گدی پر بٹھا دیے گئے۔ جانی جی سے یہاں جو کام لینا تھا کما حقہ اس کی تکمیل بھی ہو چکی۔ لہٰذا ان کو وہاں غیر ضروری سمجھ کر بھرتپور کے سات سرداروں میں شریک کر لیا گیا۔ چنانچہ ان کے نام کے ساتھ لفظ "پنچ سردار" اسی زمانے کی یادگار ہے جو آج بھی ان کی جلا [illegible] کا طرۂ امتیاز ہے۔ ملحوظ رہے کہ اس ترکیب میں "پنچ" تعداد کے معنی میں فارسی نہیں بلکہ بحیثیت اُردو ہے جو بمعنی "حَکَم" استعمال کیا گیا ہے۔

"یادگار راضی" ان کی ایک تصنیف سنہ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں چھپی ہے۔ اس میں مہتمم مطبع جو تقریظ شامل ہے اس میں "وکیل و پنچ سردار" دونوں منضبط ہیں۔ پس اگر پنچ سردار ہونا ان کی زندگی کے حصۂ آخر سے متعلق ہوتا جیسا کہ سکسینہ صاحب کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے، تو ۱۸۷۹ء کی مطبوعہ کتاب میں یہ درج نہ ہوتا۔ (باقی)

---

[1] ۱۸۲۶ء میں لارڈ کمبرمیر نے بھرتپور فتح کیا لہٰذا یہ انتظامیہ معاملات میں انگریزوں کے ماتحت آگرہ کے صوبے سے متعلق ہو گیا۔ چنانچہ قطعہ رباسی ۹ نومبر ۱۸۵۸ء سے بھی اس کا آگرے کے صوبے میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔

[2] گزیٹیر جلد دوم صفحہ ۸۰ مطبوعہ ۱۹۰۸ء نیز نیٹو چیفس اینڈ دیر اسٹیٹس صفحہ ۲۰۔

[3] مصنف G. R. Aberigh Mackay پرنسپل و ریزیڈنسی راجکمار کالج اندور مطبوعہ بمبئی ۱۸۷۸ء سکنڈ ایڈیشن نیز گزیٹیر محولہ بالا صفحہ ۲۰۔

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

تبصرہ

وحید اختر

دیوان درد

مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی

درد اردو کے اساتذۂ متقدمین میں اپنی شاعرانہ عظمت اور روحانی و علمی فضیلت کے لحاظ سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ درد کی اس بزرگی کو تمام تذکرہ نگاروں نے بھی تسلیم کیا ہے اور اکثر ناقدوں نے بھی، اس کے باوجود اب تک درد کی طرف وہ توجہ نہیں کی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے درد کا دیوان بہت محنت اور اہتمام سے شائع کیا تھا، اب وہ دیوان بھی بازار میں نایاب ہے۔ درد کے دیوان کے جو نسخے عام طور پر بازار میں ملتے ہیں وہ اغلاط سے پُر ہیں اور نہایت بے توجہی کے ساتھ چھاپے گئے ہیں۔ ظہیر احمد صدیقی نے پہلی بار یہ کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر درد کے دیوان کے متن کی تصحیح کی جائے، اس سلسلے میں انھوں نے دیوان درد قلمی مکتوبہ سنہ ۱۲۲۲ ہجری (آزاد لائبریری۔ علی گڑھ)، دیوان درد قلمی مکتوبہ سنہ ۱۲۳۲ ہجری (آزاد لائبریری۔ علی گڑھ)، دیوان درد قلمی (انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ)، دیوان درد مطبوعہ مطبع محمدی لکھنؤ سنہ ۱۲۷۱ھ اور دیوان درد مطبوعہ مطبع نظامی بدایوں سنہ ۱۹۲۳ء سے مدد لی ہے۔ انھوں نے پہلے نسخے کو اس کی قدامت کی وجہ سے اس دیوان کی ترتیب کے لئے اساس بنایا، ہر صفحے پر حاشیے میں نسخوں کے اختلاف کی تشریح و توضیح کر دی گئی ہے، اس لحاظ سے درد کا یہ دیوان پچھلے دیوانوں کے مقابلے میں مکمل اور مستند کہا جا سکتا ہے۔ مرتب نے دیوان کی ترتیب میں جتنی محنت کی ہے، اتنی توجہ کتابت اور طباعت کی طرف نہیں کی گئی، اس لئے کہ کتابت اور طباعت اس قدر غلط اور ناقص ہے کہ مرتب کی محنت پوری طرح سامنے نہیں آ پاتی، اگر اس طرف بھی توجہ کی جاتی تو یہ دیوان نگاہ و اعتبار میں زیادہ وقعت حاصل کر سکتا تھا۔

ظہیر احمد صدیقی نے دیوان پر جو مقدمہ لکھا ہے اور جو کتاب کے تقریباً پچاس صفحات پر محیط ہے، بعض حیثیتوں سے غور طلب ہے، مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات یہ آ پڑی ہے کہ انھوں نے پہلے ہی صفحہ پر لکھا ہے:۔

> "ان کی شاعری اور زندگی دونوں میں جمال اور پاکیزگی کا ایک لطیف احساس ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ صوفی شاعر کے علاوہ اور کچھ نہ ہو سکے۔"

اس اقتباس میں دو باتیں محل نظر ہیں۔ پہلے جملے کا دوسرے جملے سے کوئی منطقی ربط نہیں، اس لئے کہ اگر کسی کی زندگی اور شاعری میں جمال و پاکیزگی کا لطیف احساس ہے تو یہ کیسے لازم آیا کہ وہ محض صوفی شاعر ہی کر رہ جائے گا۔ دوسرے یہ بات خلاف واقعہ بھی ہے کہ درد کا احساس جمال ان کے تصوف کا تربیت یافتہ ضرور ہے مگر ان کی شاعری میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ محض صوفی نہ تھے بلکہ عاشق مزاج شاعر بھی تھے۔ ایسے اشعار کی ان کے یہاں کمی نہیں، دو چار مشہور شعر دیکھتے چلئے۔

> ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ● ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
>
> قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
> پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
>
> جب نظر سے بہار گذرے ہے ● جی پہ رفتار یار گذرے ہے
>
> کبھی پیغام درد کا کہنا ● گر صبا کوئے یار میں گذرے
>
> کون سی رات آن ملئے گا ● دن بہت انتظار میں گذرے

درد صوفی تو تھے ہی مگر وہ شاعر بھی تھے اسی لئے مندرجہ بالا اشعار اس قبیل کے ہیں کہ انھیں لاکھ کھینچ تان کے بھی تصوف کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔

تصوف کا عنوان قائم کر کے اس موضوع پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ درد کے سلسلے میں یہ ادعائیانہ کوشش کہی جا سکتی ہے کہ ان کے متصوفانہ نظریات کا سُراغ شاعری سے لگایا جائے۔ بعض ناقدوں کے اس اصرار کے باوجود، کہ درد کی شاعرانہ عظمت ان کے تصوف کی وجہ سے نہیں اُن کی عاشقانہ شاعری کے باعث ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ درد کی اُردو شاعری سے بھی ان کے نظام تصوف کا کچا خاکہ تو مرتب کیا ہی جا سکتا ہے، مرتب نے بعض اہم مسائل تصوف کو درد کی شاعری کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اپنی جگہ یہ بات قابل تعریف ہے، مگر کئی مقامات پر ان سے لغزش بھی ہوئی ہے، لفظ تصوف کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے نکلسن کی تاریخ ادب عربی کو کافی سمجھا ہے۔ حالانکہ تصوف پر خود نکلسن کی دوسری کتابیں موجود ہیں جن سے مدد لی جا سکتی تھی، اسی لئے یہ بحث تشنہ اور ادھوری ہے، آگے چل کر انھوں نے تصوف کے عقیدے کی بنیاد اور "تصوف کیا ہے" جیسے اہم سوالات سے بحث کی ہے، اگر اس نقطۂ نظر کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تصوف اسلامی تعلیمات کا مظہر ہے، تب بھی اس بات کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ ان افکار و نظریات سے بحث کی جائے جنھوں نے تصوف میں غیر اسلامی تصورات کی آمیزش کی۔ پھر یہ سوال ہوئے خود اہم ہے کہ ان بیرونی اثرات سے تصوف کا دامن کس حد تک وسیع ہوا اور کس حد تک متاثر ہوا، ان عنوانات کے ذیل میں ان مسائل سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود اسلامی تصوف کے دو ذہن و مسلک مکاتیب خیال ہیں جن کا اثر اسلامی فکر پر بہت گہرا پڑا ہے۔ چونکہ درد کا "طریق محمدی" ان دونوں اسکولوں سے انحراف بھی ہے اور ان کے بنیادی اصولوں کا نچوڑ بھی، اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ ان دونوں نظریات سے تفصیل کے ساتھ بحث کی جاتی اور اس بحث کی روشنی میں درد کے مسلک کو سمجھنے کی کوشش ہوتی۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود نے درد کی اردو شاعری پر بھی گہرے اثرات چھوڑے ہیں، درد کو جب ہم اردو شاعر کی حیثیت سے دیکھیں تو فوری طور پر یہ سوال

ہمارے سامنے آتا ہے کہ دردؔ نے شاعری میں مروجہ نظریات تصوف کی روایت کو کس حد تک اپنایا اور اس میدان میں اپنے اجتہاد سے کتنا کام لیا۔ دردؔ جب اس بات کے دعوے دار ہیں کہ انھوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے اختلافات و نزاعات سے قطع نظر کر کے خالص محمدی توحید کی اشاعت کی تو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ان کے اس دعوے پر ان کی شاعری کس حد تک دلالت کرتی ہے، دیوان دردؔ کے مقدمے میں ظہیر احمد صدیقی نے تصوف پر لکھتے ہوئے ان تمام مسائل کو نظر انداز کر دیا ہے، اس لئے یہ پوری بحث نامکمل اور تشنہ معلوم ہوتی ہے۔ تصوف سے بحث کا یہ سلسلہ شاعری کے ذیل میں بھی ملتا ہے، اس لئے کہ انھوں نے دردؔ کو محض صوفی شاعر ثابت کرنے کے لئے اُن کی شاعری کو تصوف ہی کے عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے، وحدت الوجود کے عنوان سے جو اشعار دیئے گئے ہیں ان میں سے کئی شعر در اصل ان کے نظریۂ وحدت الشہود کو ظاہر کرتے ہیں، اس التباس کا سبب یہ ہے کہ ان دو نظریات میں جو باریک سا فرق ہے اسے پوری طرح واضح نہیں کیا گیا۔

ایک عنوان قائم کیا گیا ہے "تمام نیک و بد اُسی کے مظاہر ہیں" اس کے ذیل میں مرتب نے لکھا ہے کہ ہادی اور مضل بھی خدا ہی کی صفات ہیں۔

"اگرچہ شریعت نے "فرق مراتب" پر نہایت زور دیا ہے
اور اس فرق کے نظر انداز کر دینے کو "زندیقی" ٹھہرایا ہے
لیکن دردؔ ظاہرِ شریعت کا احترام کرنے کے باوجود
خیر و شر دونوں کا سرچشمہ ایک ہی سمجھتے ہیں"

اس فیصلے سے دردؔ کی "متشرع شخصیت" مشکوک نظر آنے لگتی ہے، حالانکہ بات یوں نہیں، خیر و شر کا یہ مسئلہ اتنی آسانی سے نہ تو سمجھایا جاسکتا ہے نہ دردؔ کو "زندیقوں" کی صف میں بٹھانا قرین انصاف ہے، وحدت الوجود کے نظریے سے محی الدین ابن عربی نے اپنے "نظریۂ خیر و شر" کا استنباط کیا ہے، دردؔ بڑی حد تک اس کو قبول کرتے ہیں، بعض فروعات سے انھیں اختلاف ہے جس کا ثبوت علم الکتاب کے اُس وارد کے مطالعہ سے ملتا ہے جس میں انھوں نے ابن عربی کے اس نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے اس پر بھی تنقید کی ہے اور شیخ قیصری کی اس تنقید سے بھی بحث کی ہے جو انھوں نے ابن عربی پر کی تھی، دردؔ نے کہیں بھی شریعت کے اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔ وہ ابن عربی اور حتیٰ کہ خود شیخ مجدد ایسے متشرع صوفی سے بھی کہیں زیادہ شریعت ظاہری کے احکام کا لحاظ کرتے ہیں، جب تک دردؔ کے نظریۂ خیر و شر اور نظریۂ جبر و قدر کو پوری طرح نہ سمجھا جائے اس مسئلے پر کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔ اسی لئے ظہیر احمد صدیقی کا یہ فیصلہ محل نظر ہے کہ "دردؔ خیر و شر دونوں کا سرچشمہ ایک ہی سمجھتے ہیں" در اصل صوفیہ کے عقیدے کے مطابق، خیر خدا کی ذات سے ہے اور شر معدومات اضافی یا اعیان کی وجہ سے ہے، صوفیہ نے اس آیت کو اپنے اس تصور کی بنیاد بنایا ہے۔

"وہ سب کچھ تم کو دیا ہے جس کو تمہارے عین نے
لسانِ استعداد سے مانگا"

ابن عربی نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ خیر و شر کی استعداد اعیان کی اپنی ماہیت کے مطابق ہوتی ہے، اسی لئے اُن کا قول ہے کہ "اللہ تعالیٰ شے کو وہی عطا فرماتا ہے جو اس کے عین (یعنی معلوم) کا تقاضہ ہے"۔ یعنی انسانی تقدیر میں خود انسان کی رضا بھی شامل ہے۔ دردؔ نے ارادہ، فعل، اختیار سے بحث کرتے ہوئے انسانی ارادے اور اختیار کو اضافی قرار دیا ہے وہ امام جعفر صادقؓ کے اس اصول کو مانتے ہیں کہ "نہ جبر ہے نہ قدر، بلکہ معاملہ دونوں کے درمیان ہے"۔

مرتب نے مسائل تصوف کی بحث میں اُس محنت اور دقتِ نظر سے کام نہیں لیا، جس کی ضرورت تھی، اسی لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کے مرتبہ دیوان دردؔ کا دوسرا ایڈیشن چھپے تو ان روایوں اور تنقیدوں پر نظر ثانی کی جائے تاکہ اس متن کی تصحیح میں جو محنت کی گئی ہے مقدمہ بھی اس کا ہم وزن ہو سکے اس طرح اس دیوان کی افادیت و اہمیت بھی بڑھ جائے گی۔

دردؔ کا یہ دیوان مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے دو روپے دس آنے میں مل سکتا ہے، یہ دیوان اپنے متن کے لحاظ سے یقیناً اُن دواوین سے بہتر ہے جو عام طور پر بازار میں دستیاب ہوتے ہیں۔

پبلشر مدیر پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا